

یہ کتاب مجھے ایک چھوٹی سی عمر میں دی گئی تھی (۱۹۶۲ء)

بلوچی عسفیہ کہانیاں



Chakar The Great

لہ و گراناز

لہ اور گراناز مکران کے ساحلی علاقہ کھت کے رہنے والے تھے ان کے صبح وقت اور سن کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ خیال یہی ہے کہ یہ تین سو سال پہلے کا واقعہ ہے۔ ان کی کہانی کا رنگ، دوسری کہانیوں کے رنگ سے الگ ہے۔ کئی دوسری کہانیوں میں جیسا کہ سمو و توکلی مست کی کہانی، فراق اور ایک دوسرے کی شکل تک کو نہ دیکھنے کے واقعات ملتے ہیں۔ لیکن ان دونوں نے پہلے ہی روز ایک دوسرے کو دیکھا اور پسند کیا۔ مگر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ سمو بھی توکلی مست کو اتنی ہی پسند کرتی تھی اور فریفتہ تھی جتنا کہ توکلی اس کیلئے بیتاب اور بیقرار رہتا تھا۔

اس طرح لہ اور گراناز کا قصہ سب قصوں سے الگ ہے تاہم اس کی داستان اور دوستین شیرین کی کہانی میں نٹوڑی سی مطابقت پائی جاتی ہے۔ اس کی شعری داستان ہر ایک کی زبان پر ہے۔ مگر یہ کسی کو معلوم

نہیں کہ ان اشعار کا خالق کون ہے ؟ یہ گراناز کے کہے ہوئے ہیں یا
 لکّہ کے اشعار ہیں۔ ان اشعار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کلمت کے
 رہنے والے تھے کس حاکم کے دور اور کس زمانے میں تھے۔ ان اشعار
 سے کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ نہ ہی اس زمانے کے واقعات قحط، بیماریاں
 وغیرہ کا اظہار ہوتا ہے جیسا کہ قدیم شعری داستانوں کی روایت چلی آتی
 ہے۔

گراناز کے باپ کا نام میر باران تھا۔ وہ کلمت کا نامی گرامی اور
 مشہور شخصیت تھی۔ گراناز کی شادی اس نے لکّہ کے ساتھ کر دی۔ ابھی شادی
 کی خوشیاں منا رہے تھے کہ گراناز کے باپ کی اپنے دشمنوں سے جنگ چھڑ
 گئی۔ یہ جنگ عرصہ تک جاری رہی۔ ایک دوسرے سے انتقام گیری
 بلوچی رواج کی خصوصیت تھی، چنانچہ ایک دوسرے کے خون کا بدلہ لینے
 کے لئے دونوں جانب سے پیغامات اور طعنوں کا تبادلہ ہوا۔ یہ
 ایک بہت بڑی لڑائی کا پیش خیمہ تھی۔ دشمنوں نے بڑی لڑائی لڑنے
 کے لئے زور شور سے تیاری کر دی۔ ایک روز انہوں نے ہلہ بول دیا میر
 باران اور اس کا بیٹا مقابلہ کرنے کیلئے نکل گئے۔ اس کے دوسرے

چچا زاد بھائیوں اور عزیزوں نے مقابلہ کرنے میں ان کا ساتھ نہیں دیا۔
 لڈ میر باران کا داماد اپنے اور بیوی کے بنگ و ناموس کی خاطر روانہ
 ہو کر ان کے ساتھ لڑائی میں شامل ہو گیا۔ اس طرف نفری زیادہ تھی
 اور میر باران کے پاس صرف دو تین ہی آدمی تھے۔ لڑائی کے ابتدا میں ہی
 میں میر باران اور اس کا لڑکا مارے گئے۔ لڈ کو کافی زخم آئے۔ لڈ
 کا گھوڑا بھی زخمی ہو گیا۔ اس دوران لڈ کے آدمیوں نے اس کو زخمی حالت
 میں لڑائی کے میدان سے باہر نکالا۔ کہیں اسے قتل نہ کریں۔ لڑائی میں ان
 کی شکست کا حال پورے شہر میں پھیل گیا۔ کسی نے افواہ اڑا دی کہ لڈ
 میدان جنگ سے بھاگ گیا ہے اور میر باران اور اس کے بیٹے کو مرا
 ہوا چھوڑ کر راہ فرار اختیار کر چکا ہے۔ جب یہ بات گراناز تک
 پہنچی تو اسے بڑا دکھ پہنچا۔ وہ اپنے دکھ اور غم کا اظہار اشعار میں
 کرتی ہے۔

میں نے اپنی چہیتی سہیلیوں کے ساتھ
 پرسوں غزوہ غور سے کہا تھا کہ لڈ میدان جنگ سے
 کبھی فرار نہیں ہو گا۔ وہ اپنی جان قربان کر دے گا

مگر جب اُسے، اس کے راہ فرار اختیار کرنے کی خبر ملتی ہے
 تو وہ پھر اپنی سہیلیوں سے یوں مخاطب ہوتی ہے۔
 ”میں اپنے تمام کپڑے شادی کے بند کردوں گی۔ گھر کو ویران ہی
 سمجھوں گی۔ اپنے کانوں سے سونے کی بالیاں نکال دوں گی۔
 ان سب کو کسی ویرانے میں رکھ دوں گی اور پھر اپنے کو بیوہ سمجھ
 کر ماتم کرنے بیٹھوں گی۔“
 وہ لکھ کو طعنہ دیتی ہے۔

میدان جنگ میں لوگ تلواریں چلاتے ہیں۔ دشمنوں پر دندان شکن وار
 کرتے ہیں۔ وہ اپنی حسین محبوباؤں کو بھول جاتے ہیں۔ مگر تجھے شاید اپنی
 محبوباؤں کی حسین یادیں اور گرم مجلسیں اپنے بزرگوں کے گھروں کی ٹھنڈی
 چھاؤں کی یاد ستانے لگی۔ شاید زیادہ تر تمہیں میرا چاند سا چہرہ یاد آ
 گیا۔ میرا ناز و انداز اور گرم مجلسیں یاد آ گئیں۔ اور تم جنگ سے بھاگ
 گئے۔ لیکن لکھ یاد رکھو!۔ آج کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے روزِ محشر
 تک تم میرے باپ اور بھائی کی طرح رہو گے۔“

وہ لکھ کو بھی طعنہ دیتی ہے کہ میدان جنگ میں تمہیں سب کچھ فراموش

کر کے مرانگی کے جوہر دکھانے تھے۔ نہ کہ اپنی محبوباؤں، دوستوں اور آرام و اسٹش کی خاطر بھاگنا تھا۔ اس لئے اب تم اس قابل نہیں رہے کہ شوہر کی حیثیت سے میرے ساتھ عیش و عشرت کی زندگی گزارو۔ اب تمہاری حیثیت ایک باپ بھائی اور بیٹے کی سی ہوگی۔

لہٰذا جب اپنی پری جیسی بیوی کے ان طعنوں کی خبر ہو گئی تو اُسے نہایت تکلیف ہوا کہ وہ آج تک زخموں سے چوڑ ہے۔ اور انتقام لینے کی خاطر ابھی تک دشمنوں کے پیچھے گیا ہوا ہے۔ لہٰذا ایک جیالا بلوچ تھا۔ اُس نے بھی قسم اٹھائی کہ

”گراناز تم محشر کے دن تک بھنگ کے نشہ میں مدہوشی کے وقت بھی میری بہن کی طرح رہو گی“

لہٰذا گراناز کے طعنوں نے آگ لگا دی تھی۔ انتقام کی آگ زیادہ بھڑک اٹھی۔ اسے افسوس تھا تو اس قدر کہ گراناز نے دوسروں کی باتوں پر بھڑک کر اسے بھگوڑا قرار دیا ہے۔ جبکہ اس کی حالت تو یوں تھی کہ

”چودہ گویاں ابھی تک میرے جسم میں ہیں۔ اور تلواروں کی کاری

ضربیں تو اس کے سوا ہیں“

لہنے دشمنوں سے انتقام لینے کا عہد کیا۔
 ”بلوچوں کا انتقام دو صدیوں تک اس طرح تازہ اور جوان رہتا
 ہے۔ جس طرح کہ پہاڑی ہرنیاں دو دانتوں والی بچیاں جوان
 ہوتی ہیں۔“

لہنے کمر بستہ ہو کر دشمن پر حملہ کیا۔ میر باران اور اس کے بیٹے کا
 خوب جی بھر کر انتقام لیا۔ پھر اس نے اپنی محبوبہ گراناز کو پیغام بھیجا۔
 ”میں نے تمہارے باپ اور بھائی کے انتقام
 کی خاطر پہاڑی درہ پر گھات لگائی۔ ان کا
 انتقام لے کر کیلجے کو ٹھنڈا کیا۔ اور اپنے
 دامن سے سب داغ مٹا ڈالے ہیں۔“

کچھ عرصہ بعد گراناز کو حقیقت معلوم ہو گئی کہ لہنے کے میدان جنگ
 سے بھاگنے کی خبر جھوٹ تھی۔ وہ لڑائی میں زخموں سے چوڑ چوڑ ہو گیا
 تھا۔ اور ابھی اس کے زخم بھی ٹھیک ہوئے تھے کہ اس نے اس کے
 باپ اور بھائی کا انتقام بھی لے لیا ہے۔ وہ اب پیشیان ہو گئی کہ اب
 کیا کرے۔ اس کے باپ بھائی تو جنگ میں مر گئے۔ اور اپنے شوہر کو خود

ٹپنے دے کر اپنے سے دُور رکھا اور بھائی بنا لیا۔ پھر اللہ کے قسم کی بات
اسے معلوم ہو گئی تھی۔ اس کی مجلسوں اور محبت سے بھی محروم ہو گئی۔
اب اس کے لئے دنیا اندھیرا تھی۔ اس کے لئے اب کون رہ گیا تھا۔ لہٰذا بھی
اس کی جدائی میں جل جہنم رہا تھا۔ اس کے لئے دنیا تاریک ہو گئی تھی۔ وہ اپنی
نازک اندام محبوب کی لمس سے محروم ہو گیا تھا۔ وہ ان جذبات کا اظہار
اشعار میں یوں کرتا ہے۔

”اے گراناز تم سے تو جنگل کے تنے اور لکڑیاں اچھی
ہیں۔ جن کو سیلاب کا پانی دُور دُور سے بہا کر لے آتا
ہے۔ جو اونچی جگہوں پر رُک جاتی ہیں۔ جنکو اب نہ
ہوا ہلا سکتی ہے اور نہ سیلاب کا پانی بہا کر لے جا
سکتا ہے۔ جنہیں میرے عزیز چُن چُن کو اپنے نازک
کانڈھوں پر ڈالے راتوں کو چراغ کی مانند جلاتے ہیں
اور یہی رات بھر میری طرح جل جل کر میرے دکھ درد
کے سانچے ہوتے ہیں۔“

لیکن ہر ایک کو اپنے قول کا پاس تھا۔ وہ اپنی اپنی ضد پر اڑے

رہے۔ کسی نے دوسرے کی جانب پہل نہیں کی۔ اور جدائی کی آگ میں جلتے رہے۔ روحیں تڑپتی ہیں۔ آخر، اللہ کی ماں اور اس کے بھائی نے اس سے کہا کہ گرانا زوہ ابھی تک تمہاری بیوی ہے۔ مگر وہ نہیں مانا اور دونوں کے قول و سوگند یاد دلائے کہ اب وہ میاں بیوی کس طرح رہ سکتے ہیں۔ آخر انہوں نے کسی قاضی سے فتویٰ لیا۔ اس نے فتویٰ دیا کہ لہ بھگ پینے سے توبہ کرے اور گرانا ز کبھی زیورات نہ پہننے سے توبہ کرے۔ اس طرح دونوں کی قسمیں پوری ہوں گی۔ اور وہ میاں بیوی کی حیثیت سے رہ سکیں گے۔ اس طرح دونوں پھر یک جان و دو قالب ہو گئے۔ اور دو پیاسی روحوں کا ایک بار پھر ملاپ ہو گیا۔ دونوں ہنسی خوشی میاں بیوی کی زندگی گزارنے لگے۔

دوستین اور شیریں

دوستین بلوچوں کے رند قبیلے کا ایک فرد تھا۔ دوستین نے جب عالم شباب میں قدم رکھا تو اس دوران بیرونی دشمنوں نے بلوچوں کے علاقوں پر

حلقے شروع کر دیئے۔ رندو لاشاری قبیلے کی آپس کی طویل جنگ کے وقت وہ کمسن تھا۔ اس لئے اس جنگ میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ صوبہ دار سید بہا الدین بخاری سہون کے بختیار بیگ اور بکھر کوٹ کے جاگیردار اور نائب میر معصوم اپنی متحدہ فوجوں کے ساتھ بلوچوں کے علاقوں کو ختم کرتے ہوئے سیوی پر بھی قابض ہو گئے۔ وہ اس جنگ کے دوران گرفتار ہو کر قیدی بنا دیا گیا۔ اور قیدی کی صورت میں ہٹنڈ کے شہر میں لا کر گلہ بان بنا دیا گیا۔

اس جنگ سے پہلے دوستین کی منگنی، شیرین کے ساتھ ہو چکی تھی۔ شیرین میر لعل خان کی بیٹی تھی۔ میر لعل خان، بہادر اور نڈر اسحاق کا نزدیکی رشتہ دار تھا۔ لعل خان بھی اسحاق کے ساتھ ہر وقت چراگاہوں کی تلاش میں رہتا تھا۔ وہ ایک جگہ پر نہیں رہتے تھے۔ خانہ بدوشانہ زندگی گزارتے تھے۔ اس وقت جب دوستین گرفتار ہو گیا تو شیرین ایک معصوم سی بچی تھی۔

دوستین کی گرفتاری کے بعد، رندوں نے دوستین کا بہت انتظار کیا اور اس کی کافی کھوج لگائی۔ مگر اس کے بارے میں کسی کو بھی کچھ معلوم

نہ ہو سکا۔ اب شیریں کئی سال گزرنے کے بعد جوان ہو گئی تھی۔ مگر دوستین ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ اور نہ ہی اس کی زندگی کے بارے کوئی حال معلوم ہوا۔ انہوں نے اب فیصلہ کر لیا کہ شیریں کی دوسری جگہ شادی کر دی جائے۔ کیونکہ ان کو یقین ہو گیا تھا کہ دوستین اس دنیا میں نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شیریں بولتی تھی کہ اگر کسی عورت کے گھر میں بیٹا پیدا ہو اور اس کا نام دوستین رکھے تو میں اسی کے ساتھ شادی کروں گی۔ وہ دوستین کی یاد میں تڑپتی تھی۔

رندوں نے اس کا سراغ لگانے کے لئے کسی کو ہرنڈ کے شہر میں بھیجا تھا وہ اس کی تلاش میں گھر گھر گھومتا ہوا آخر اس تک پہنچا۔ اس نے اسے حال دیا۔ شیریں کی محبت بھری باتیں اور پیغام بھی اس تک پہنچائے جیسا کہ دوستین اپنے اشعار میں کہتا ہے۔

”ایک شخص خراسان کی جانب سے آیا ہے۔ اسکے کپڑے
میلے اور گرد آلود ہیں۔ مگر اس کی باتوں سے خوشبوؤں کی
نہک اٹھتی ہے۔“

کیونکہ ان باتوں میں شیریں کا تذکرہ ہے۔ اس نے اپنے ملک کا حال

دوستین کو اشعار میں یوں بتایا ہے ۔

”کونارو کے شہر میں خوب برسات ہوئی ہے۔ منگوچر

کے دشت و دامن کو برس برس کر بھڑہ زار بنا دیا ہے۔“

اس نے ان اشعار میں اپنے خطہ وطن کے اس سال آباد و خوشحال ہوئے اور مال مولیشیوں کی اچھی حالت کے بارے میں اسکو بتایا۔ کیونکہ دوستین خود بھی مال مولیشیوں کا مالک تھا۔ اس کا گزارہ بھی مال مولیشی پلٹے پر تھا۔ وہ شعر کی زبان میں اس طرح اس کے وطن کی آبادی کے بارے میں اسے بتایا ہے۔

”بھیڑیں خوشبودار درنو گھاس سے خوب سیر ہیں اور بکریاں

پھاڑی گلاب کے پھولوں سے۔“

ہٹند میں قید ہونے اور اونٹوں کے گلے کے چرانے کے کام پر مامور

ہونے کے بارے میں دوستین کہتا ہے۔

میں ہٹند کا مشہور قیدی اور اونٹوں اور اصطلبلوں کی خدمت

پر مامور ہونے کے باوجود شیریں کے نام پر فدا ہوں۔ اپنی

بیوی کی خوش قسمتی سے آخر میں ہٹند کی قید سے آزاد

ہو گیا ۔

عید کی صبح تھی ۔ گھوڑے دوڑ کی بازی لگی ہوئی تھی ۔ دوستین بھی اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر دربار میں آیا ۔ حاکم وقت سے پوچھا ۔ مجھے اجازت ہے اس نے کہا ۔ ہاں اجازت ہے ۔ وہ یہی سمجھا کہ شاید مقابلہ میں حصہ لینے کی اجازت لے رہا ہے ۔ وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور اسے ایک چابک لگا دی ۔ آکر حاکم وقت کے سامنے سے گذرا اور بولا ۔ آپ نے مجھے اجازت تھی ۔ لو اب میں جا رہا ہوں ۔ میں نے جو قول دیا تھا کہ تمہاری اجازت کے بغیر کبھی نہیں جاؤں گا ۔ اسے پورا کر دیا ۔ اب اس نے کہہ کر گھوڑے کا رخ مغرب کی طرف کر دیا اور گھوڑا گویا ہوا میں اڑتا جا رہا تھا ۔ تب ہرنند کے حاکم کو اپنی غلطی اور دوستین کی ہوشیاری کا علم ہوا ۔ مگر اب وہ ہوا چکا تھا ۔

ادھر شیرین اس کے لئے بیقرار تھی ۔ اور اس کے اس پیغام نے تو اس کو اپنی جان کی بازی لگا دینے کی ترغیب دیدی ۔

” اے اچھے خاندان کے امیر اور آقا ، قید خانہ میں بند میرے خوشبو سے معطر محبوب ! اب جلدی چلے آؤ “

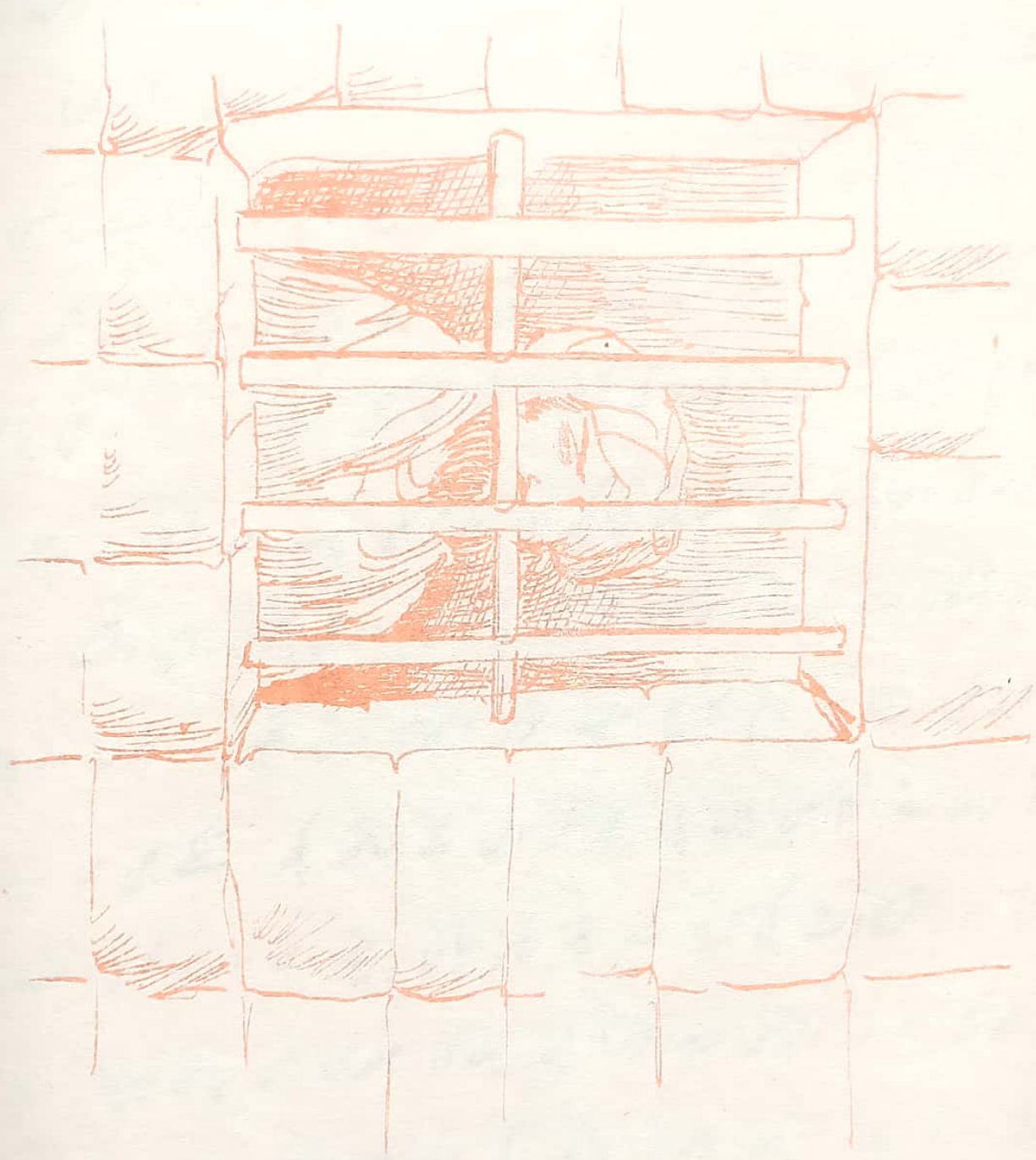
دوستین منزل طے کرتا ہوا اپنے علاقے ترک میں پہنچا۔ وہاں اس نے عجیب سماں دیکھا۔ وہ کافی عرصہ بعد واپس آیا تھا۔ اس نے وہاں بہت سے لوگوں کا ہجوم دیکھا۔ لوگ انتہائی خوش تھے۔ کباب پک رہے تھے۔ رقص و سرود کی محفل گرم تھی۔ وہ حیران ہوا۔ اس روز شیریں کی شادی دوستین نامی دوسرے شخص سے ہو رہی تھی۔ دیرانے میں شہر کا سماں تھا۔ اصلی دوستین اب تک نہیں پہنچا تھا۔ اس لئے مجبوراً دوسرے دوستیں کی شادی ہو رہی تھی۔ مگر اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ لیکن اس گہما گہمی سے الگ تنگ ایک لڑکا نثر بجا رہا تھا۔ اور یادگار اشعار کا گاکر روتا تھا۔ دوستین نے اس سے پوچھا۔ کیا بات ہے۔ وہاں تو رقص و سرود ہے اور تم رو رہے ہو۔ اس نے کہا آج شیریں کی شادی ہے۔ جو میرے بھائی دوستین کی منگیتر ہے۔ میرے بھائی کا کسی کو علم نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ زندہ ہے کہ مردہ۔

دوستین بھی آکر محفل میں شریک ہو گیا اور وہی شعر سنانے لگا جو اس کی محبوبہ نے اس کی شان میں کہے تھے۔ اور پیغام کی صورت میں بھیجے تھے۔ لوگوں نے ان اشعار اور اس کی خوش الحانی کو سن کر اسے پہچان لیا کہ یہ تو دوستین ہے۔ رندوں نے فوراً اس کو گلے لگایا۔ دوسرا دوستین اصلی

دوستین کو دیکھ کر شادی سے دستبردار ہو گیا۔ کہ حق اسی کا ہے۔ دوستین
 اور شیریں کی شادی اسی وقت ہو گئی۔ اور شیریں کی یہ دعا قبول ہوئی۔
 ”اے خدا تو بادشاہ صفت ملک دوستین کو واپس
 لے آ۔ اس دوسرے کو نہیں، اصلی دوستین کو لے آ۔“

نشہ مرید اور حانی

نشہ مرید اور حانی کی داستان تمام بلوچوں میں مشہور ہے۔ مگر مختلف
 شکلوں میں کوئی اس کی شعری داستان کی مختلف مثنوی کو بنیاد بناتا ہے۔
 تو کوئی اس میں زبانی روایات عطا دیتا ہے۔ مگر بہت کم لوگ اس کی اصل حقیقت
 سے آگاہ ہیں۔ مری قبائل کی روایات کے مطابق نشہ مرید، نشہ مبارک کا بیٹا
 تھا اور حانی میرمندو کی بیٹی تھی۔ وہ بچپن میں اکٹھے کھیلتے کودتے تھے۔
 مگر اس وقت ان کی ملگنی نہیں ہوئی تھی۔ جب دونوں جوان ہوئے تو حانی
 کی خوبصورتی اور زیبائی تمام رندوں میں بیشتال تھی۔ کوئی رند دوشیزہ اس







کے پائے کی نہیں تھی۔ ایک روز زندوں کے سردار میر چاکر نے دیکھا تو اس کے سن پر عاشق ہو کر اس سے شادی کا ارادہ کیا۔

چاکر ایک جابر اور زبردست سردار تھا۔ اس کی طاقت و قوت کے سامنے شہ مرید اور حانی کی عشق و محبت کا بس نہیں چل سکتا تھا۔

اس کہانی کے اصل حقائق پر اب بھی تاریکی کا پردہ پڑا ہے۔ کسی نے اصل حقیقت معلوم کرنے کے لئے تحقیق و جستجو نہیں کی ہے۔ اب تک کسی کو معلوم نہیں کہ ان دونوں کی آخری شادی بھی ہوئی تھی یا نہیں۔

ایک دوسری روایات کے مطابق چاکر اور شہ مرید ایک روز شکار پر چلے گئے جب وہ شکار سے لوٹے تو رند خواتین پانی بھر رہی تھیں۔ اس وقت۔

عورتیں اپنا ہر کام کاج سب خود انجام دیتی تھیں۔ انہوں نے پانی مانگا۔ تو حانی نے گلاس میں پانی بھر کر اس کے ساتھ کچھ تنکے بھی ملا دیئے تاکہ گرمی اور تھکاوٹ کی وجہ سے تیز تیز پانی پینے سے اسے کوئی نقصان نہ پہنچے۔ کیونکہ سفر کی واپسی سے فوراً بعد جلدی جلدی میں پانی پینے سے دل پر اثر ہوتا ہے۔ ایک بار تو چاکر کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ دیکھو اس گستاخ اور پیباک خاتون کو جو اپنے سردار کے پانی میں بھی تنکے ملائی

ہے۔ دوسری طرف میر چاکر کی بیوی نے سادو اور صاف پانی گلاس میں ڈال کر شہ مرید کو پلایا۔ اس سے شہ مرید بیمار پڑ گیا۔ تب چاکر کو اس عورت کی عقلندی سمجھ میں آئی اور اس نے اس کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

حانی کو جو کہ شہ مرید کی منگیت تھی۔ حاصل کرنے کے لئے میر چاکر سوچتا رہا۔ تا آنکہ اسے باآسانی موقع ملا۔ آگیا۔ اس کی روایت یہ ہے کہ اس طرح ہے۔ رند قبائل میں سب سے معزز اور قابل تعظیم وہی شخص تصور ہوتا تھا جسے اپنے قول کا پاس ہوتا تھا۔ بلوچی ننگ و ناموس میں اپنے قول کو نبھانے میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس طرح ایک اجتماع میں رندوں کی برگزیدہ شخصیتوں نے اپنا اپنا قول دیا۔ اور اپنے قول کو پورا کرنے کی قسم اٹھائی۔ جاڑو کے بیٹے نے جب اس کی دائڑھیوں پر ہاتھ لگایا۔ تو اس نے اپنے قول کے مطابق اس کا سرق سے جدا کر دیا۔ ان قولوں کے بارے میں اشعار میں یوں ذکر آیا ہے۔

”بہادر میر جاڑو نے قول دیا کہ جو بھی میری دائڑھی کو

ہاتھ لگائیگا۔ اسے میں کبھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ شان

و شوکت والے میر عالی نے قول دیا کہ جس کے بھی
اونٹ، میرے گٹے میں آکر شامل ہوں میں ان کو
واپس نہیں دوں گا۔ خواہ کچھ بھی ہو۔

اسی طرح اُس دیوان میں شہ کٹی نے قول دیا کہ جو شخص بھی میرے
راستے پر آئے سامنے آئے ہیں۔ اس کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ایک روز
بیورغ رند کا باپ میر باہر رند جب اس کے راستے پر آیا تو اس نے
اس کو قتل کر ڈالا۔ میر چاکر کے اونٹ جب میر عالی کے گٹے کے ساتھ
مل گئے تو اُس نے انہیں واپس کرنے سے انکار کر دیا اور جنگ پر
آمادہ ہو گیا۔

اس اجتماع میں شہ مرید بھی موجود تھا۔ اس نے قول دیا کہ جمعہ کی صبح سویرے
جو شخص بھی مجھ سے جو کچھ مانگے۔ میں اسے دیدوں گا۔ اس طرح چاکر کو موقع ہاتھ
آیا۔ اس نے فقیروں کو اس کے پاس بھیجا کہ اس سے صبح سویرے حانی کو طلب
کر لو۔ فقیر شہ مرید کے پاس صبح سویرے پہنچ گئے۔ انہوں نے اس سے حانی
کو طلب کیا۔ انہوں نے تین مرتبہ اپنے اس مطالبے کو دہرایا۔ شہ مرید نے
اپنے قول کا پاس رکھتے ہوئے حانی کو انہیں بخش دیا۔ اس طرح حاکم خان حانی

کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

جب شہ مرید کو یہ پتہ چلا کہ اس کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے تب وہ حانی کے فراق میں شہ مرید خوش الحانی اور پر سوز آواز میں شعر کہتا تھا۔ اس کے فراق میں شعر گا گا کر اپنے جذبات کا اظہار کرتا۔ اور حانی کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ چنانچہ وہ حانی کو ایک نظر دیکھنے، ایک رات میر چاکر کے گھر کو دگیا۔ اور تین مرتبہ چاکر کی گھوڑی کو کھولا۔ جسے باندھنے کے بہانے تین مرتبہ حانی باہر نکلی دوسری صبح میر چاکر نے دربار میں اس واقعہ کا یوں حال معلوم کرنا چاہا۔

رات جب بجلی کو نڈی تو کون سویا ہوا تھا۔ اور کون جاگ رہا تھا۔ سب نے جواب دیا کہ کسی کو رات بجلی چمکنے کا علم نہیں۔ جبکہ رات بھر بالکل بادل نہیں تھا تو بجلی چمکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مگر مرید نے اس سوال کا جواب دیا۔

”سردار مجھے خوب یاد ہے۔ میں صبح صبح حال اور نقوش
بتاؤں گا۔ کل رات، میر چاکر کے محل کے نیچے خانہ کے دروازے

پر جب بجلی کوندی تھی تو دوبار تو گویا شعلے بھڑک اٹھے
تھے۔ مگر تیسری مرتبہ سیاہ بادل چھا گئے تھے۔

اس بھری محفل میں رندوں کے قومی سردار کی بیوی کے بارے میں اس طرح کا
بیان معمولی بات نہیں تھی۔ اس کے لئے جگر گردہ اور ہمت درکار تھی۔ مگر شہ مرید
کو کسی کی پردہ نہیں تھی۔ رات کو حانی کو علم ہو گیا تھا کہ چاکر کے محل میں آکر
گھوڑی باندھنا، کسی اور کا کام نہیں ہو سکتا۔ تو وہ اسے دیکھنے نکلی تھی۔
وہ تینوں مرتبہ باہر آگئی تھی۔ پہلی مرتبہ اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ جو بجلی
کے کوندنے کی طرح روشن تھا۔ دوسری مرتبہ اس نے دوپٹہ اوڑھ لیا گویا چاند
بادلوں میں چھپ گیا۔ تیسری مرتبہ جب اس کے بال بکھرے تو گویا آسمان
پر سیاہ گھمبیر ہال چھا گئے ہوں۔ اس گفتگو پر اس کے باپ کو سردار چاکر
نے متوجہ کیا کہ اس کا لڑکا بڑا بیباک اور گستاخ ہو گیا ہے۔ اس پر شہ
مبارک نے بڑا منایا کہ سردار کی شان میں ایسی گستاخی اچھی نہیں۔

شہ مبارک نے اپنے پیر سے جوتی نکالی اور شہ مرید کے پردے ماری۔ شہ
مرید نے اپنے باپ کی جوتی کو بوسہ دیا۔ پھر اس کو واپس کر دیا۔ اور اپنے
باپ سے بولا۔

اگر آج کسی نے رندوں کے سردار کو جوتا رسید کیا ہوتا تو آج میدان
خون سے سرخ ہو جاتا۔ چاروں جانب رندوں کی ٹیڑھیں رفتار گھوڑیاں، سواروں
سے بہائے گئے خون میں نہا چکی ہوتیں۔

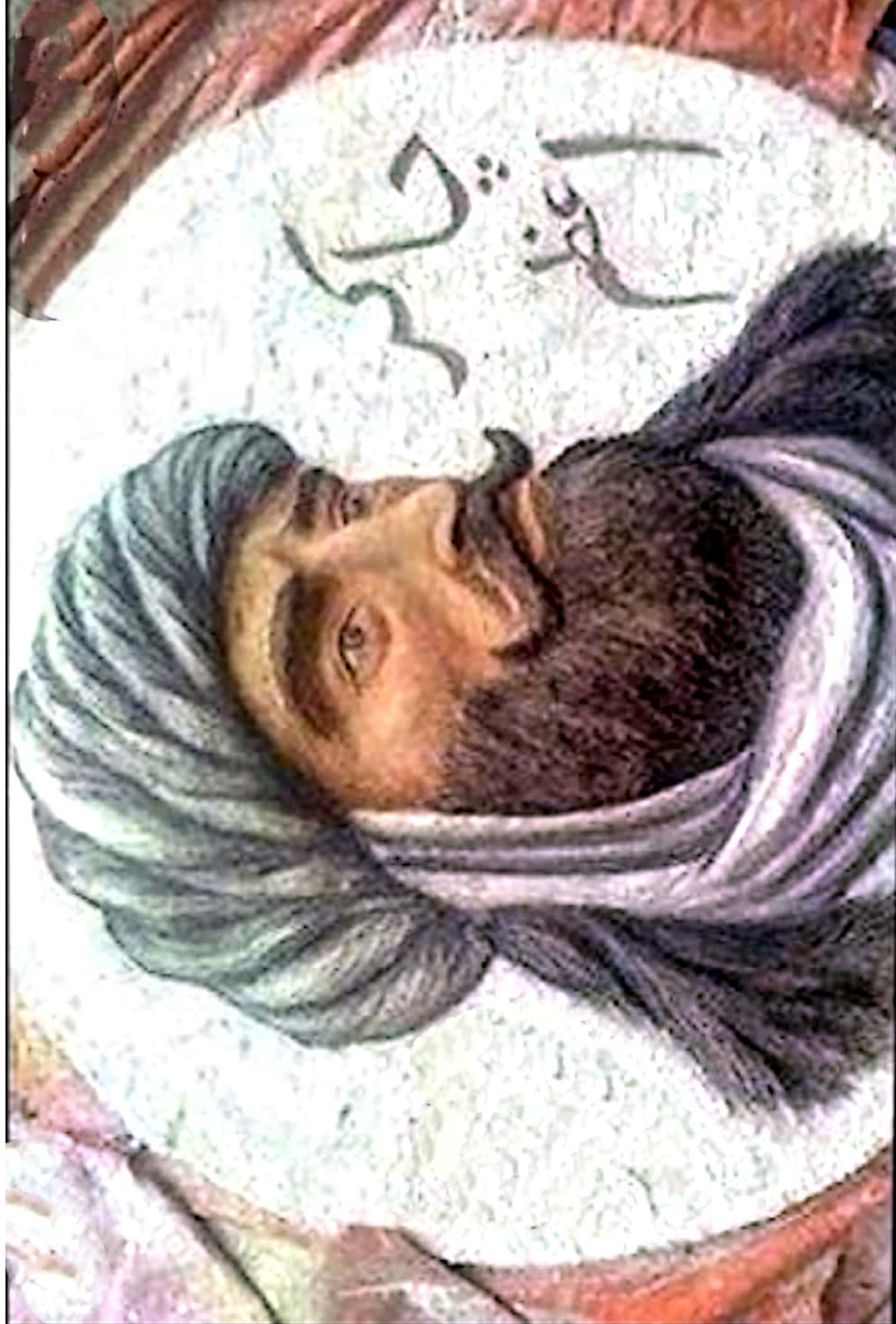
اس کشمکش میں شہ مرید کسی جانب چل پڑا۔ اور جج کرنے کا ارادہ کیا کہ
اب رندوں سے اس کا گزارہ مشکل ہے۔ اس امر کا اظہار وہ یوں کرتا ہے۔
”مجھے قول ہے کہ میں اپنے وطن اور اپنے لوگوں کو حسین مانوں کی خاطر
چھوڑ کر ان فقیروں کے ساتھ چلا جاؤں گا جو صدائیں دے دے
کر روٹ مانگ مانگ کر اپنے پیٹ کی بھوک مٹاتے ہیں۔“

وہ کافی عرصہ کعبہ میں رہا۔ کئی جج کئے۔ پھر فقیروں کے ساتھ تیس سال بعد
سب کو واپس ہوا۔ اب رندو لاشاری قبائلی کی جنگ ختم ہونے کو تھی۔ ان کی طاقت
دقت کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ مرید اسی زمانے میں وطن وٹا۔ عید کی صبح تھی۔
لوگ نشانہ بازی میں مصروف تھے۔ مگر کسی کا نشانہ صبح نہیں بیٹھتا تھا۔ رند
سب جمع تھے۔ شہ مرید بھی اس مجلس میں شریک ہو گیا۔ انہوں نے کئی
کمان اس کو نشانہ بازی کے لئے دیئے۔ مگر وہ سب ایک ہی وار میں
ٹوٹ پھوٹ جاتے تھے آخر کسی نے کہا۔ جا کر شہ مبارک کے گھر سے

شہ مرید کا کمان لے کر آئیں۔ ایک آدمی اس کے گھر سے جا کر اسے اٹھا لایا۔ شہ مرید نے کمان اٹھا کر شست باندھی۔

مرید کی بھاری بھر کم کمان کو لایا گیا۔ اس کے اوپر بھڑ بکریوں کے بچے اچھل کود کر اسے گندہ کر چکے تھے۔ رندوں کی عورتیں نظارہ کر رہی تھیں۔ شہ مرید نے کمان کو اٹھا کر سات مرتبہ اسے چوم لیا اور پھر شست لیکر نشانہ پر سیج۔ صحیح تیر مارا۔ تب رندوں کو شک ہوا۔

شہ مرید نے اپنی کمان شناخت کر لی تھی، اسے دست کر کے یکے بعد دیگرے سات تیر پھینکے جو ایک ہی جگہ پر نشانہ میں صحیح صحیح لگے۔ رندوں نے شہ مرید کو گھیر لیا۔ ان کو شک ہوا کہ فقیروں کے بھیس میں ہی شہ مرید ہی ہو گا۔ انہوں نے اسکو جانے سے روک دیا۔ کسی نے جا کر حانی سے اس کی نشانیاں دریافت کیں جو اس نے بتا دیں انہوں نے اس کو اب شناخت کر لیا۔ اب تمام رندوں نے یک زبان ہو کر میر چاکر کو منت سماجت کی کہ وہ شہ مرید کے حال پر ترس کھائے اور حانی کو اسے





بخش دے۔ میر چاکر نے اعتراف کیا کہ حانی کبھی اس کے ساتھ ہم بستر نہیں ہوئی ہے۔ چنانچہ اس نے مجمع میں اعلان کر دیا کہ اس نے حانی شرمہ کو بخش دی۔

شہ مرید نے اس شاہزادہ بخشش کو یہ کہہ لینے سے انکار کر دیا کہ اب اس قابل نہیں رہا۔ تاہم حانی نے اس کے ساتھ جانے پر اصرار کیا چنانچہ دونوں کا نکاح پڑھا گیا۔ اور دونوں کو ایک اونٹنی پر سوار کر کے روانہ کر دیا۔ روایت ہے دونوں ازلی عاشق اور معشوق اب تک زندہ ہیں اور اونٹنی پر سوار کبھی کبھار رہگیروں کو نظر آیا کرتے ہیں۔

شاہداد اور مہناز

شاہداد سردار چاکر زند کا بیٹا تھا۔ بلوچی تاریخ میں شاہداد کا نہایت اہم کردار رہا ہے۔ بلوچی شعرو ادب میں بھی وہ بڑی حیثیت اور بڑے درجے کا مالک ہے۔ قدیم تاریخ پر اگر نظر ڈالی جائے تو



شاہداد کی شخصیت ہمیں ابھرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ شاہداد نے پہلی بلوچی ریاست کی داغ بیل ڈالی۔ مزید یہ کہ رندو لاشاری قبائل کے جنگ چھڑنے کیوقت زبایات کے مطابق شاہداد اور راین لاشاری کی آپس میں گہری دوستی تھی۔ دونوں ہم عمر تھے وہ آپس میں شیردشک تھے۔ ان کا ٹمنا بیٹھا ایک تھا۔ پھر یوں ہوا کہ ایک دوشیزہ کی محبت میں ان کا آپس میں جھگڑا ہوا۔ اور تلخی پیدا ہو گئی۔ پھر راین نے گوہر جتئی کی اونٹنیوں کے پھڑوں کو مار ڈالا جو رندوں کے پناہ میں تھی۔ اس طرح ذاتی رنجش اور کدورت تیس سالہ لویل جنگ کا باعث بن گئی۔

بابر اور ہمایوں کی افواج میں بھی بلوچ شامل تھے۔ پانی پت کے میدان میں مغلوں نے لودھیوں کو شکست دے کر تخت و تاج حاصل کر لیا۔ بابر کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں تخت پر بیٹھا۔ اس کے اپنے بھائی اس کے دشمن تھے۔ اس نے بلوچ لشکر کے ساتھ دوسری افواج جمع کر کے کابل قندھار جا کر اپنے دشمنوں کو شکست دے دی۔ مگر اسے شیر شاہ سوری نے شکست دیکر تخت و تاج پر قبضہ کر لیا۔ وہ سندھ کی جانب بھاگ گیا۔ اسے تو قلعہ تھی شاہ اس کے باپ کی نیکیوں کے

بدے اسے کوئی امداد اور پناہ دے۔ تو شیرشاہ سوری نے اپنے قاصد چاروں طرف روانہ کئے۔ ہر ایک نے ہوا کا ٹیخ دیکھ کر اس کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ آخر مجبور ہو کر وہ بلوچوں کے پاس چلا آیا کہ اگر بلوچوں نے مدد کی تو ٹھیک ورنہ وہاں سے ایران چلا جائے گا۔ بلوچوں نے اپنے باہوٹ کی اپنی روایات کے مطابق اپنی شان اور غیرت کے مطابق خدمت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ہمایوں بلوچی علاقوں میں گھومتے سیوی سے مری کے علاقے میں آیا۔ چاکر نے خود ہمایوں کو خوش آمدید کہا اور اسے ایوان تک پہنچانے کے بعد، واپسی پر اس کی ہر قسم کی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ ہمایوں ایران سے فوج لے کر واپس ہوا۔ بلوچوں نے اپنی فوجیں اس کے حوالہ کر دیں۔ ایرانی اور بلوچی فوجوں نے کابل و قندھار کو فتح کر لیا۔ اور شاہ بلوچ کو گورنر مقرر کر دیا۔ پھر فوج دہلی کو فتح کرنے کے لئے روانہ ہو گئی۔ میدان جنگ میں سوریوں کو شکست دے کر دہلی کے تحت و تاج کو دوبارہ حاصل کیا۔ اس جنگ میں بلوچ لشکر کی کمان شاہداد کر رہا تھا۔ فتح کے بعد ہمایوں نے بلوچ سردار کی بہت عزت کی اور ان کی جنگی حذا کے صلے میں منگمری کا علاقہ ہمایوں نے بلوچوں کو دے دیا۔ عرصہ تک یہاں

ایک بلوچی ریاست قائم رہی۔ سوریوں اور ہمایوں کی جنگ کے بارے میں شاہداد کی ایک مشہور نظم تمام واقعات کو سموئے ہوئے بلوچی ادب کا قیمتی سرمایہ ہے۔ جس میں اس کی بہن مائی بانڑی کی بہادری کے کارنامے بھی بیان کئے گئے ہیں۔

شاہداد کی دو بیویاں تھیں ایک کا نام مہناز تھا اور دوسری کا مرگو۔ وہ مہناز سے بہت پیار کرتا تھا۔ اور اسے عزیز رکھتا تھا۔ سوکن کو یہ سوک کبھی پسند نہیں آیا۔ اور سوکن پن اپنے اصلی رنگ میں نمودار ہوتا ہے۔ مرگو نے سوکن پن میں حسد سے کام لے کر دھوکا اور مکاری کا ایک جال بچھایا۔ شاہداد کی عموثر نامی ایک چرواہے شخص سے دوستی تھی۔ ان کی ایک دوسرے کے ہاں آمدورفت تھی۔ ایک مرتبہ عموثر اپنے دوست کے پاس سیوی چلا آیا۔ وہ دونوں دوست رات گئے تک بیٹھ کر چرائی باتیں ایک دوسرے کو سناتے رہے اور ہم مجلس رہے۔

مرگو اپنے حسد اور سوکن پن میں موقع کی تلاش میں تھی۔ وہ اس انتظار میں تھی کہ کب اپنے منصوبہ کو عملی جامہ پہنائے اور انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کر کے اسے ایک موقع ملے گا۔ وہ اپنی چارپائی

سے اٹھ کر ماہناز کے ہاں اس کی چارپائی کے پاس چلی گئی۔ اس نے اس کی چیل خود پہن لی۔ اور واپس لوٹی۔ عومر نیند میں گہری سانسیں لے رہا تھا۔ مرگو نے آہستہ آہستہ اس کی چارپائی کے گرد ماہناز کی چیل پہنے۔ کئی چکر کاٹے پھر ماہناز کی چیل خاموشی سے پہلی جگہ پر رکھ دی۔ صبح کے وقت شاہداد نے عومر کو ناشتہ کرانے کے بعد۔ اسے الوداع کہا۔ اور گھر چلا آیا۔ مرگو سے پوچھا۔ ماہناز کہاں ہے؟ اسے کہہ دو مجھے کھانا کھلائے۔ اس وقت ماہناز، غسل کر رہی تھی۔ مرگو بولی۔ میرے آقا۔ پہلے تمہاری چہیتی بیوی اپنے بال سکھائے گی۔ پھر سردار کو کھانا کھلائے گی۔ پھر مرگو نے خوشامدانہ لہجے میں کہنا شروع کیا۔ سردار عومر نہ تمہارا بھائی ہے اور نہ ہی تمہارا رشتہ دار ہے۔ وہ یہاں صرف ماہنو کی خاطر آتا ہے۔ ان کے آپس میں راز و نیاز ہیں۔ تمہاری چہیتی بیوی نے تمہاری شان شوکت، عزت اور غیرت کو خاک میں ملایا ہے۔ نہ ہی اسے اس بات کا خیال ہے کہ وہ خود کس کی بیٹی ہے۔ اس نے لنگڑے عومر کے ساتھ دوستی گانٹھ لی ہے۔ جب کبھی عومر آیا ہے تو ماہناز کو کوئی روک نہیں سکتا۔ کل رات بھی ماہناز خود عومر

کے پاس چلی گئی تھی۔ رات بھر اس کے ساتھ رہنے کے بعد، صبح سویرے آکر سوئی ہے۔ اس کے چپل کے نشان چارپائی تک میں نے خود دیکھے ہیں۔ میں تمہاری وفا شعار بیوی ہوں۔ مگر مجھ پر تو کبھی آپ توجہ نہیں کرتے۔ آپ اپنی چھیتی بیوی کی کزنوت دیکھ لو۔ اس قسم کی باتیں سن کر شاہداد کا سر پکڑنے لگا۔ وہ اٹھا اور پیروں کے نشان اٹھائے۔ اور گھر سے لے کر عومر کی چارپائی تک نشانوں کا سراغ لگاتا ہوا گیا۔ بات واقعی صبح تھی۔ واپسی کے نشانات بھی اس نے دیکھے۔ وہ غصے سے بولا۔ عومر نے نہایت بے عزتی اور بے شرمی کا کام کیا ہے۔ عومر اگر ایک عزت مند بلوچ نہ تھا۔ تو ماہناز نے بھی اپنے آباء اجداد کی غیرت و حیا کا کچھ خیال نہیں کیا۔ مرگو کا تیر نشانے پر بیٹھا۔ شاہداد نے ماہناز کو سسرال بھیج دیا کہ تم پہلے چلی جاؤ۔ میں بعد میں آؤں گا۔ کیونکہ سفر میں کافی وقت لگتا ہے۔ ماہناز کی نیت صاف تھی۔ چونکہ وہ سسرال جا رہی تھی، رواج کے مطابق وہ اچھے کپڑے اور زیورات پہن کر جانے کے لئے تیار ہوئی۔ اس پر شاہداد کا شک اور یقین میں بدل گیا کہ بن مہن کر کیوں جاتی ہے۔

مرگو نے دیکھا کہ جھوٹ کامیاب ہو چکا ہے۔ تو اس نے خاموشی سے بات کو خوب ہوا دی اور اس کو لعن طعن کرتی رہی کہ اس نے اپنا منہ کالا کر کے عومر جیسے ذلیل لنگڑے کے ساتھ دوستی کر لی ہے۔ اور اسے خدا تباہ کرے کہ اس نے خاندان کی عزت کو مٹی میں ملا دیا۔

ماہناز اس وقت اپنے سسرال ڈھاڈر میں تھی۔ اسے جب یہ حال معلوم ہوا کہ مرگو نے اس طرح سے بدنام کرنے کے لئے چال چلی ہے۔ تو اسے بہت دکھ ہوا۔ شاہداد کی بھی ماہناز سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ وہ اپنے دل کی بھڑاس اشعار میں نکالتا تھا۔

”اے میراثی میرے ان کہے ہوئے اشعار کو لیبا کر
اس بے وفا ماہنو تک پہنچا۔ میری جہیتی ماہناز کو
بتا۔ اگر تمہارا دوست میں نے گھومتے ہوئے
دیکھا ہوتا تو میں توار اس کے سینے سے اس طرح
آر پار کرتا کہ اس کی لاش اڑ کلیجہ اور گوشت
کو، گدھ اور چھیل کھا کھا کر سیر ہو جائے۔
تب میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوتا۔“

اب راز راز نہیں رہا تھا۔ تمام لوگ ان کے کشیدہ تعلقات اور حالات سے واقف ہو چکے تھے۔ مگر ماہناز اس امید پر زندہ تھی کہ جھوٹ کی عمر دماز نہیں ہوتی۔ وہ ان افواہوں پر کان نہیں دھرتی تھی۔ لیکن شہداد کا کلام ماہناز نے سنا۔ تو اسے محسوس ہوا کہ اب پانی بہر سے آگے بڑھ چکا ہے۔ جب وہ شہداد کے اس قسم کے اشعار سنتی تو اس کا کلیجہ منہ کو آتا ہے

” وہ (عوض) صبح مال چرانے چلا جاتا ہے۔ شام کو بد حال اور بدبوؤں سے بھرا ہوا لوٹتا ہے اور وہ تمہارے گھر میں داخل ہو کر تمہاری قربت کسی خوشبوؤں سے جی پہلاتا ہے اور تمہارے بدن سے کیلتا ہے۔“

اس قسم کے الزامات اور طعن سے بھرپور تیز اشعار کو سن کر ماہناز کا جذبہ انتقام جاگ اٹھا۔ وہ بھی ایک پرہیزگار اور صنفی عورت تھی۔ غافلانہ اور برادری کے لحاظ سے شہداد سے کم تر نہ تھی۔ ان کا خون ایک ہی تھا۔ وہ میران رند کی بیٹی تھی۔ جو ہاکر کا چہیتا بھتیجا تھا۔ وہ عرصہ سے سسرال میں تھی۔ شہداد کو اشعار کی صورت میں ماہناز کی جانب سے اس قسم کے

اشعار لوگ سناتے۔

”اے سفر پر جانے والے لوگو : اس محل میں جا کر

میر شاداد سے اگر ملاقات ہو تو میری طرف سے سلام

کہنے کے بعد، میرے چچا زاد بھائی کو میرا پیغام پہنچا دو

کہ اب تم جواں مردی کے جوہر دکھانے اور کسی اور

کام کرنے کے قابل نہیں رہے۔ اب تم شرم سے

گھر میں منہ لٹکائے بیوی کے پاس بیٹھے رہتے ہو۔“

پھر وہ اپنی محبت دوستی اور گدے ہوئے لوگوں کے مارے

پیغام بھیجتی ہے۔

میں نے تمہارے گھر کے لئے چٹائیاں بنیں ہز ہفتہ میں

کئی کئی قسم کے کپڑوں پر کشیدہ کاری کی تھی۔“

ایک رات جب ساداد شکار سے واپس آ رہا تھا۔ ماہناز اپنی تین چار سہیلیوں

کے ساتھ آ رہی تھی۔ اس نے اس کا راستہ روکا۔ اس واقعہ کو ماہناز اشعار

میں یوں بیان کرتی ہے۔

تم تین چار بہادر سواروں کے ساتھ شکار کھیلنے کے



بعد واپس آ رہے تھے۔ میں بھی اپنی تین چار سہیلیوں کو
لیکر تمہارے راستے پر بیٹھ گئی۔ میں نے ایک ہاتھ سے
تمہاری گھوڑی کی مضبوط لگام کو تھاما اور دوسرے
ہاتھ سے تمہارے پیر پکڑ لئے۔“

اس پر آپ نے مجھے طلاق دے دی اور مجھے دھکا دے کر اپنے
راستے سے ہٹا دیا۔

”تم نے مجھے ایک زور دار دھکا دے کر پیٹھ کے
بل گرا دیا۔ میری خوشبوؤں سے معطر زلف، مٹی سے
آلودہ ہو گئی اور تم نے خوش ہو کر مجھے تین اشریاں
گن کر دے دیں۔ تم اپنی اس حرکت پر خوش و نازاں
تھے اور میں بعد مجبوری ان کو قبول کر لیا۔ ان کو اٹھا
کر اپنے دوپٹے کے پلو میں باندھ کر محفوظ رکھا تا کہ
گم نہ ہو جائیں۔“

ماہناز کو اپنی پاکیزگی اور غیرت مندی پر فخر تھا۔ وہ اپنی شرافت پر
پورا پورا یقین رکھتی تھی۔ اس کا دل گواہی دیتا تھا کہ وہ بے عیب ہے۔

اور اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ روایت ہے کہ مرگو کو اس کی فریب کاری نے کوئی فائدہ نہیں دیا۔ وہ شاہداد کی نظروں میں کوئی مقام پیدا نہ کر سکی۔ بلکہ شاہداد نے اسے پہلے سے بھی کم اہمیت دی۔ اب لوگوں کو بھی مرگو کے جھوٹ اور فریب کا علم ہو چکا تھا اور ماہناز کی معصومیت اور بے قصوری پر یقین تھا۔

ماہناز اپنے کردار کے بارے میں یوں اظہار کرتی ہے۔

”میں بڑے بڑے پتوں والی اس انجیر کے درختوں کی مانند ہوں جو پہاڑیوں کی ان ندیوں سے اگتے ہیں۔ جہاں کوئی پہنچ نہیں سکتا۔ میں بلندو بالا پہاڑی کی چوٹی کی مانند ہوں جس کو کوئی سر نہیں کر سکتا۔ دکن کی جانب سے جو گرم ہوائیں چلتی ہیں وہ درختوں پر آگ برساتی ہیں۔ لیکن میرے سر کو کوئی ہوا بھی نہیں ہلا سکتی ہے۔ میرا دامن عومر سے استدرہ دور و پاک ہے کہ اسے قید کی مٹی تو چھو سکتی ہے لیکن عومر کبھی چھو نہیں سکتا۔“

توکلِ مست اور سمو

توکلِ مری قبیلے کے شیرانی شاخ سے تعلق رکھتا ہے۔ چٹانوں کے سائے میں زندگی گزارتا تھا۔ میدان گری نامی جگہ کا باشندہ تھا۔ توکلِ اس کا نام تھا اور سمو پر اس قدر دیوانہ و فریفتہ تھا کہ لوگوں نے اسے مست کا لقب دیا۔ سمو کے عشق کی بنا پر سمو بیل (سمو کا ساتھی) کے نام سے بھی لوگ پکارتے ہیں۔ اب مری قبائل میں وہ توکلِ کے نام کے بجائے مست کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔ مست توکلِ کے چھڑ بھائی تھے۔ ولنٹر اس کا بڑا بھائی تھا۔ بگٹی قبائل کیساتھ جنمپڑی کے مقام پر ایک لڑائی میں ولنٹر مارا گیا۔ مست بھی اس لڑائی میں شریک تھا۔ اس لڑائی کے بارے میں ایک جگہ وہ کہتے ہیں۔

چھترپی کی لڑائی میں صف اول میں شامل تھا۔

ولنٹر چلا گیا اور میں واپس آ گیا۔

اس لڑائی کے بعد جنگ سے مست کا دل بھر گیا۔ اور وہ جنگ سے

نفرت کرنے لگا۔ وہ امن و آشتی کا پرستار بن گیا۔ لڑائی کے خون خرابے سے تنگ آکر امن پرستی کا علمبردار بنا اور یوں پرچار کرنے لگا۔
 ”جنگ کی بڑی باتیں اچھی نہیں ہیں۔ اس سے دوستوں اور عزیزوں سے محروم ہونا پڑتا ہے۔“

لڑائی میں اپنے بڑے بھائی کے مارے جانے کے بعد اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتا ہے۔

میں اپنے دل میں خوش تھا کہ اب مجھے اچھا دور اور فائدہ نصیب ہوگا مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ مجھے اب اس سے بھی زیادہ کٹھن امتحان اور جستجو میں گزارنا پڑے گا۔
 مست کے سب بھائی اس کی زندگی میں فوت ہو گئے جیسا کہ وہ خود کہتا ہے۔

”ان چھ بھائیوں سے اب میں اکیلا رہ گیا ہوں۔“
 مست توکل ایک صوفی قسم کا شاعر تھا۔ اس کے بھائی دلنسر اور پیرک کی دنات پر اس جہان کے فانی ہونے اور ناپائیداری سے اس کا دل دنیا سے ٹوٹ گیا۔ اور یہی اثر اس کی شاعری میں نمایاں ہے۔

پیرک کی موت کی خبر سن کر وہ یوں کہتا ہے ۔

” ایک خط ہزاروں الفاظ پر مشتمل مجھ تک پہنچا جس میں پیرک کی موت کی دلخراش خبر اور گزین کے سلام درج ہیں ۔ کچھ لوگ فتح کی خوشی منا رہے ہیں ۔ اور میں پیرک اور سمو کے غم میں جمل رہا ہوں ۔ اب خوش و خرمی کے ساتھ ان دونوں عزیزوں سے کبھی ملاقات نصیب نہیں ہوگی۔“

وہ اپنے دکھ و غم کا شکوہ بھی کرتا ہے ۔

ایک طرف میں چلا آتا ہوں تو دوسری جانب سے لاشیں اٹھائے لوگ آتے ہیں ۔ یا الہی میں نے کونسا گناہ کیا ہے جس کی یہ سزا

ملی ہے ۔“

روایت ہے کہ مست نے پیرک کے سرور کو لیجا کر کھڑی پہاڑ پر رکھا جو جاندران کے علاقے کے مغرب کی جانب واقع ہے ۔ کہتے ہیں کہ ابھی تک جس رات بادل چھائے ہوں ، وہ خود بخود بجھنے لگتا ہے ۔

میں پیرک کے پُرسوز سرور کو پہاڑی کی چوٹی پر محفوظ کر لوں گا ۔ تاکہ فرشتے اسے بجائیں اور محبوبائیں اس کی

طرف متوجہ ہو کر سُنیں ۔

تو کلی مست بچپن سے ہی غمگین اور مغموم رہا کرتا تھا۔ وہ مال مویشی
چراتے وقت کئی بار ان کو بھی بھول جاتا تھا۔
مست تو کلی اور ستمو کے عشق کی ابتداء جھنڑی کی لڑائی کے بعد ہوتی
ہے، وہ اس لڑائی کے بعد ایک روز سیر و سفر کی خاطر رسترائی پہاڑ کی جانب
چلا گیا ۔

پُرسوں میں رسترائی کی پہاڑیوں کے ندی نالوں سے ہوتا ہوا
ایک بیابان اور وسیع میدان میں جا نکلا ۔

مست اور ستمو کے عشق کی کہانی یوں شروع ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ
برسات کے موسم میں وہ سفر کر رہا تھا کہ رسترائی پہاڑ کے دامن میں بارش
شروع ہو گئی۔ ادھر ادھر سر چھپانے کی جگہ ڈھونڈی تو اس کی نظر ایک
خانہ بدوش کے خیموں پر پڑی۔ وہ وہاں چلا گیا۔ اسے باہر تھلے پر بٹھایا
گیا۔ جب بارش ہو گئی تو اسے خیمہ کے اندر لیجایا گیا۔ ستمو اپنے شوہر
کے ساتھ باہر خیمہ کی لکڑیاں میخیں اور رسیوں کو مضبوط کرنے میں مصروف کار
تھی تو بارش سے ستمو کے کپڑے بھیگ گئے۔ اس وقت بجلی چمکی۔ ستمو کے

بے بال، بجلی کی چمک سے عیاں ہو گئے۔

”تند دیتیز ہواؤں نے خیمے کی میخیں اکھاڑ ڈالیں

اور اس کے دوپٹے کو اڑا لے گیئیں۔“

اس طرح پہلی نظر پڑتے ہی مست، سمو پر جان و دل گنوا بیٹھا۔ وہ رات
بھر اسے سمکتا ہی رہا۔ جب لوگوں نے اس کی طرف توجہ کی تو وہ بے ہوش
پڑا ہوا تھا۔

میرا اسی روز مجنوں کی طرح دل شیدا ہو گیا۔ دیرانے اور

بیابانوں میں بے ہوش اور مست ہو کر رہ گیا۔“

اس واقع کے بعد مست کی زبان پر صرف سمو کا نام تھا۔ اور بس۔

اس نے سمو کے نام شاعری شروع کی۔ اس کے ہر شعر میں سمو کی جانب
اشارہ و کنایہ موجود ہے اگر کبھی کسی نے اس کی دعوت و مہمانی کی تو
وہ کہتا کہ سمو کا بھی حصہ دیدو۔

سمو مری قبیلہ میں پھردٹ شاخ سے تھی اور کابلان کے مشرقی جانب

رہتی تھی۔ مست اپنی شاعری میں پیار و محبت سے اسے شکل اور سمی

کے ناموں سے بھی یاد کرتا ہے۔ وہ مال مولیٰ چراتی تھی اور شام

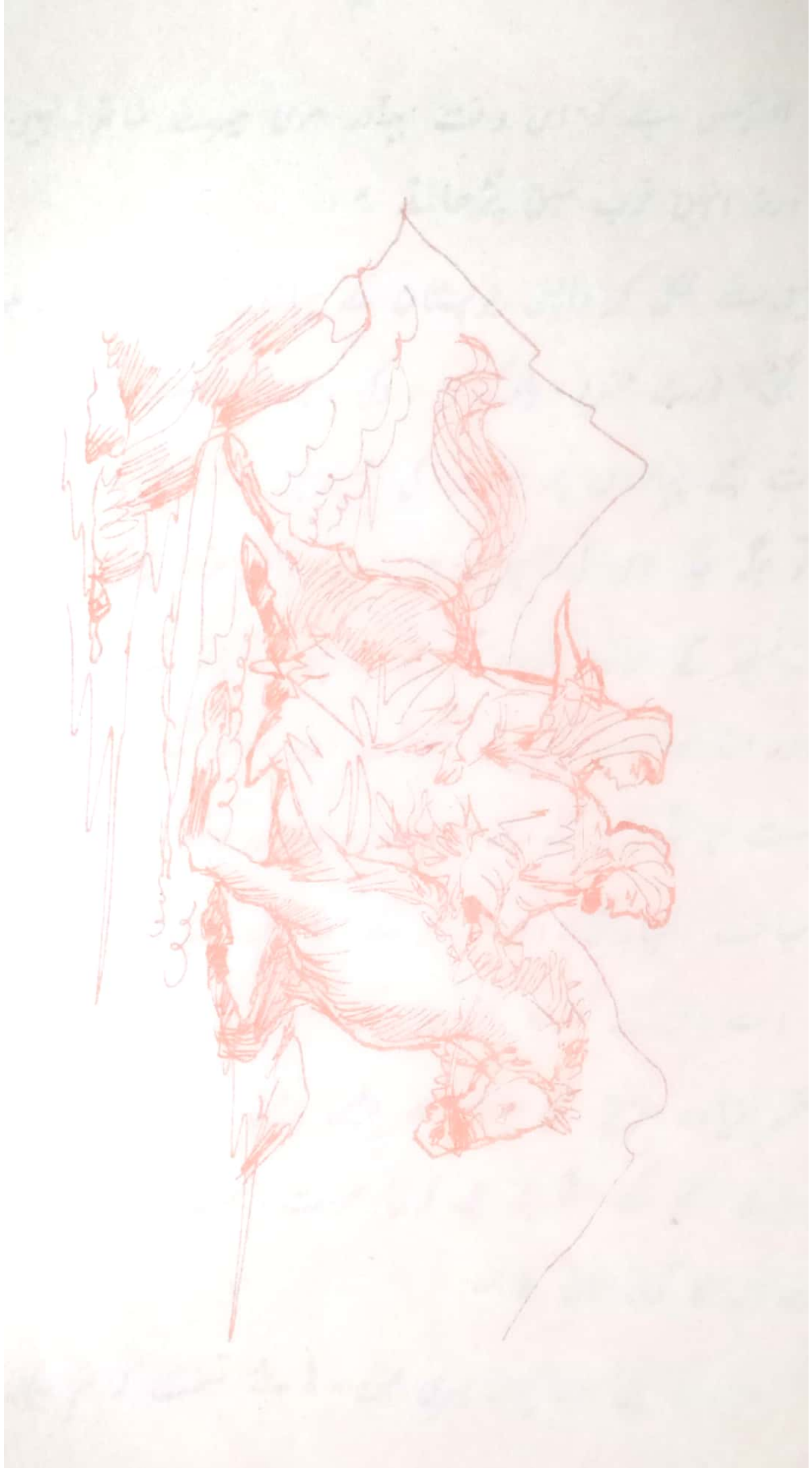
کو گھر چلی آتی تھی، وہ ننگے پاؤں مال مویشی چرائی رہتی تھی۔ اس پر
مست بے قرار تھا کہ وہ کیوں اس حال میں ہے۔
” پھر دن تم لوگوں پر قہر ٹوٹے کہ تم لوگوں نے سمو کو بکسریاں
چرانے پر مامور کیا ہے اور رسترائی پہاڑ پر مال مویشیوں کے ساتھ
بیٹھتے ہو۔“

اور پھر کہتا ہے۔

” وہ جوتوں کے بغیر مال مویشیوں کے پیچھے ٹہلتی
اور گھومتی پھرتی ہے۔“

مست تو کلی سمو کی یادیں لئے بلوچستان کے گوشے گوشے میں گھومنا
پھرا۔ وہ ملتان میں فقیروں و بزرگوں کی درگاہوں کی زیارت کے لئے
ملتان و لاہور چلا گیا۔ وہاں سے دہلی پہنچا تو انگریزوں نے اسے ایک
پاگل سمجھ کر قید خانہ میں بند کر دیا۔ اس قید کے بارے میں وہ کہتا
ہے۔

” دلی کا شہر آباد و خوبصورت ہے، اس میں بدشکل کا لے لوگ
جمع تھے۔ میں نے ان بزدلوں کے دھکے، قید اور ظلم سہے۔ مجھے



افسوس ہے کہ اس وقت بہادر مری میرے ساتھ نہیں ہے۔
ورنہ انہیں خوب سبق پڑھاتے ۛ

وہ جیل سے نکل کر واپس بلوچستان کے پہاڑوں میں چلا آیا۔ بلوچستان میں مری گہٹی، فورٹ منرو، بارکھان، دکی، بوری، سیوی اور ڈھاڈر کے تمام مقامات کے پہاڑوں پر مست کی مسجدیں موجود ہیں۔ مری کے علاقے میں تو جگہ جگہ اس کی مسجدیں ہیں۔ وہ جہاں جاتا پتھروں سے مسجد بنا لیتا۔ مسجد کے دروازہ پر وہ پتھر کے چولہے پر پتھر کے توے بنا کر رکھتا تھا اور ان توؤں پر پتھر کے گھوڑے اور سوار بنا کر رکھتا تھا۔

مست ہر جگہ سمو کے لئے مست و مدہوش رہتا۔ اور اس کی خاطر سیروسیاحت اختیار کی۔ اس کا سمو کے سوا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا اور نہ ہی اسے اس کے علاوہ کسی چیز کی ضرورت نہ تھی۔ اسے دنیا کی ہر شے سے سمو زیادہ عزیز تھی۔ اس نے دیس دیس اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا مگر اسے سمو کے مقابلے میں کوئی عورت آنکھوں میں نہیں سٹائی۔ اور نہ ہی اسے اس کا کوئی ثانی ملا۔

”کہاں ہیں اور کہاں میری محبوبہ۔ ہائے قسمت کہ تم مجھے

کہاں پہنچ کر لے جاتی ہو۔ میں سکون کی تلاش میں سمو کا
منتظر ہوں۔ سمو تمہاری خوبصورتی اور ناز و ادا پر
میں قربان ہو جاؤں۔ جان سے زیادہ عزیز میری خواہش
کہ تمہاری محبت کبھی بھی میرے دل سے ختم نہ ہو۔ اور
میں تمہارے پرانے بندھنوں میں ہمیشہ کے لئے گرفتار رہوں۔
مست تو کلی ایک مرتبہ سندھ سے بلوچستان کی جانب آ رہا تھا۔
اس نے راستے میں کونجوں کی قطار کو محو پرواز دیکھا۔ تو اس کا دل ٹپ
اٹھا۔

کونجیں اچھی موسم میں سندھ سے واپس ہو جاتی ہیں۔ ان کونجوں
کی قطاروں کے ساتھ میں بھی محو سفر رہوں گا، کونج سیر کرنے اور میں
سمو کے دیدار کی خاطر کونجوں کی قطاروں کے ساتھ چل رہا ہوں
کونج پرواز کر رہے ہیں۔ اور میں پیادہ محو سفر ہوں۔ کونجوں
کی دل بھانے والی آوازیں اور چھپاٹیں میرے دل کو
نہیں بھاتیں۔ اور میرے درد و غم کا علاج نہیں ہیں۔ میرے دل کو
تو سمو کی مسکراہٹیں اچھی لگتی ہیں اور میرے درد کا علاج

وہی مسکراہٹیں ہی تو ہیں۔“

جس طرح مست ستمو کے لئے بیقرار رہتا تھا۔ اس طرح ستمو بھی اس کے دیکھنے کو ترستی تھی۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ مست جب کافی عرصہ سندھ سے نہ لوٹا تو اس نے کسی سے پوچھا کہ تم نے مست کو دیکھا ہے۔ کہ نہیں۔ اس نے اس سوال و جواب کے بارے میں آکر مست کو مطلع کر دیا۔ ان جذبات کا اظہار وہ یوں کرتا ہے۔

”بادوں سادوں کی گھٹاؤں کی طرح آسمان پر چھا کر سمر کے دیس برستے ہیں۔ وہ کھڑی ہو کر ان کا لے باروں کا نظارہ کرتے ہوئے بیقراری اور بیتابی سے ان بادوں سے پوچھتی ہے۔ کیا تم نے سندھ میں مست دیوانے کو گھومتے ہوئے نہیں دیکھا ہے؟ میرا دل دیوانہ ہے کہ مست کی آس لگائے بیٹھا ہے۔ بادلوں نے اسے جواب دیا کہ اب وہ بہت دُور کے علاقوں سے تمہیں دیکھنے چل پڑا ہے۔“

ایک مرتبہ مست نے کسی پہاڑ میں ایک فقیر کو دیکھا جس کے کان بڑے بڑے تھے۔ وہ فقیر بھی دنیا سے کنارہ کش اور پنچا ہوا شخص تھا۔ مست

اس کے نزدیک گیا۔ اور اس سے مخاطب ہوا ۛ

اے گدھوں جیسے کان والے فقیر مجھے بھنگ کا پیالہ بھر کر دے

تاکہ ان کو پی کر میں سمو کی یادیں مزاموش کر دوں۔“

ایک دن مست توکلی اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ سیر و تفریح کر رہا تھا کہ اچانک وہ کامان سے سمو کے گھر کی جانب چل پڑا۔ مست کو محسوس ہوا مست نے اپنے ساتھیوں کو کہا کہ تم لوگ سمو کے گھر آ جاؤ۔ میں جلدی میں جا رہا ہوں۔ وہ جلدی میں ان کی نظروں سے غائب ہو گیا۔ وہ سیدھا سمو کے گھر پہنچا۔ وہاں جا کر لوگوں کو ماتم کرتے ہوئے پایا۔ اسے بتایا گیا کہ سمو فوت ہو گئی ہے۔ وہ سمو کی قبر پر چلا گیا۔ وہ لوگوں پر بہت غصہ ہوا کہ اسے بتائے بغیر انہوں نے سمو کو کیوں دفنایا ہے۔ مست عالم مدہوشی میں وہاں کھڑا رہا۔ اس کی خبر پر ایک کمرہ بنوا کر کافی عرصہ وہاں قیام کیا۔ اب اس کی سیر و سیاحت اور آمدورفت ختم ہو چکی تھی۔ وہ ہر وقت مغموم رہا کرتا تھا۔ اب مست کے لئے صرف دو کام ہی رہ گئے تھے ایک اس کی قبر کی تعمیر تزیین اور دوسرا اس کی شان میں شعر کہنا ۛ

”مجھے آسمان کے فرشتوں نے بتایا ہے کہ سمو باغ طوبیٰ میں حوروں کے ساتھ بیٹھی ہے۔“ کبھی کبھی وہ اس کی قبر سے کچھ دنوں کے لئے اُٹھ کر چلا جاتا مگر پھر جلد واپس آ کر قیام کرتا۔ اور گیت گاتا رہتا ہے

آج مست سندھ کے گھر گھر گھوما پھرا ہے مگر
 پورے سندھ میں سمو وہ تمہارا بدل ڈھونڈنے
 میں ناکام ہی رہا۔۔۔

سمو کی رفات کے بعد، مست تو کلی عموماً بیخود رہتا تھا۔ پگڑی پہننا ترک کر دی تھا۔ جوتے پہننا بھی چھوڑ دیئے۔ صرف سمو کی قبر کی زیارت کرتا رہتا۔ ایک نظم میں سمو کی جدائی کا اظہار یوں کرتا ہے

”اے مرید (شہ مرید) میری آہ و فزاد سن میں سمو پر
 اس طرح دیوانہ اور اس کے لئے بیقرار و بے سکون ہوں
 جس طرح تم حانی کے لئے تھے“

مست تو کلی گھوم پھر کر سیوی سے ہوتا ہوا کٹ منڈائی کے علاقے میں چلا گیا۔ وہیں وہ بیمار پڑ گیا۔ بیماری کی حالت میں پشہرہ کے علاقے تک پہنچا۔ وڈیرہ ڈیرہ خان پھوادی کا مہان ہوا۔ بیماری

جب زیادہ خطرناک ہو گئی۔ تو اس نے شیرانیوں کو اطلاع دیکر بلایا۔
 وہ مست کو لیکر چلے گئے۔ وہ جب کوہلو سے مغرب کی طرف پندرہ میل
 دور گرمی کے مقام پر پہنچے تو اسے یہاں اونٹ سے اتارا پینے کے
 کے پانی نہیں تھا۔ مست نے یہاں زمین سے اپنی کرامات سے پانی نکالا۔
 آج تک وہ چشمہ اس جگہ بہہ رہا ہے۔ اس طرح یہاں اس کی روح اپنی
 خاک بدن سے پرواز کر گئی۔

صدور اور گراناز سے بیورغ کے معاشقے

شیردل اور بہادر بیورغ میرباہر کا بیٹا تھا۔ میرباہر پترند تھا۔
 بیورغ، سردار شیبک کا نواسہ اور میرچاکر کا بھانجہ تھا۔ میربیورغ
 نے اپنے بچپن کا زمانہ بیکج مکران میں گزارا تھا۔ وہ دوسرے بہادر ساتھیوں
 کے ساتھ مکران سے بولان فتح کرتا ہوا سیوی تک پہنچا۔ بیورغ رند،
 بلوچی ننگ و ناموس، شان و شوکت کردار غیرت، بہادری و مہمان نوازی
 کا حسین پیکر تھا۔ بلوچی کردار کی تمام خصوصیات اس میں موجود تھیں۔ وہ

رندوں کی سرکردہ شخصیات اور بڑے رہنماؤں میں سے ایک تھا وہ چاکر کا
 مشیر تھا۔ وہ نہایت ہی ہوشیار اور عقلمند انسان تھا۔ اس نے شعری
 ادب میں اپنے پیچھے بہت بڑا سرمایہ چھوڑا ہے۔

بیورغ کی گراناز کے ساتھ محبت کی کہانی بلوچوں میں سب سے زیادہ
 مشہور مقبول ہے۔ بیورغ اور گراناز کا بلوچی عشقیہ شاعری میں بڑا مقام ہے
 اور بڑے کردار کے مالک ہیں۔ گراناز قندھار کے ارغون کی بیٹی تھی۔ وہ
 بادشاہ کے گھر میں شہزادی کی حیثیت سے ناز و نعمت میں پل رہی تھی۔ جب
 گوہر جتئی کی عزت کی خاطر۔ رندو لاشار قبائل کی طویل جنگ شروع ہو گئی۔
 نلی کی جنگ میں رندوں کو بڑی شکست ہوئی۔ ان کے کئی سو رما کام آئے۔
 بیورغ چاکر کو لڑنے سے منع کرتا رہا تھا مگر چاکر انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ اس کے
 عزیز ترین ساتھی اور میران جیسا بہادر بھتیجا نلی کی جنگ میں کام آچکے تھے۔ اب چاکر نے
 انتقام لینے کی خاطر، ترکوں سے امداد طلب کی اور بیورغ کو سفیر بنا کر
 قندھار بھیجا تاکہ مدد مانگے اور ان کی فوجیں ساتھ لائے۔

بیورغ قندھار میں فوجیں لانے گیا تھا۔ ارغون بادشاہ نے اس کی بڑی
 آؤ بھگت کی۔ اور صلاح مشورے جاری تھے۔ بیورغ نے چاکر کو خود آنے

کا پیغام بھیجا اور خود ادھر ہی قیام کیا۔ ایک روز بادشاہ کے محل پر اس کی نظر شہزادی گراناز پر پڑی اور اس کو دل دے بیٹھا۔

”میں نے کالی ناگن جیسی زلفوں والی ایک حسینہ دیکھی ہے جو بادشاہ کے محل کی ساتویں منزل پر رہتی ہے۔“

اس دوران چاکر خود آیا۔ ترکوں کو امداد کے لئے راضی کر لیا۔ بیورن کو اپنے پیچھے فوجیں لانے کے لئے چھوڑ کر خود واپس چلا گیا۔ وہ فوجیں لے کر واپس آیا۔ اور گراناز کو پیچھے چھوڑ دیا۔ صرف اس کی تمنا اور دیدار کی یادیں اس کے دل پر نقش بن گئیں۔ رندوں نے ترکوں کی فوج کے ساتھ لاشاری قبائل پر گاجان کے مقام پر ہل بول کر بھرپور انتقام لے لیا۔ لاشاریوں سے سخت انتقام لینے کے بعد، اب چاکر کو قرار آیا۔ اور لاشاریوں کی تباہی کے اس واقعہ کے بارے میں وہ فخریہ گاتا ہے۔

”میں نے گاجان کو ہڈیوں کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا ہے۔ جہاں

ایک سال تک گیدڑوں اور درندے انسانی ہڈیاں کھا کھا کر اپنی

بھوک مٹائیں۔“

ترک مال غنیمت میں سے اپنا حصہ لے کر واپس قندھار جہاز گئے۔

سیوی کو واپس آیا۔ اب بیورغ کو کسی کل چین نہیں آتا تھا۔ اور گراناز کی یاد میں بیقرار رہتا تھا۔ وہ پھر گراناز کی طرف، قندھار، چل پڑا۔ چاکر کو خبر ہو گئی کہ بیورغ بڑی نیت سے قندھار گیا ہے۔ تو اس نے کسی دوسرے بہانے سے قندھار کے حاکم کو قاصد بھیجا کہ وہ بیورغ کو قید میں ڈالے تاکہ بیورغ اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر چاکر کے

لئے تڑکوں کی دشمنی کا باعث نہ بنے۔ بیورغ کو قید کر دیا گیا۔

”میں قید خانہ میں قید کر دیا گیا۔ اور بادشاہ کی دہکیاں اور مصائب

میرا مقدر بن گئیں۔“

جب چاکر پھر دوبارہ قندھار چلا گیا تو اس نے بیورغ کو قید سے آزاد

کروا دیا۔

”اب میں حاکموں کی قید، پہریداردوں کے دھکوں اور بے عزتیوں

اور جیل کی زنجیروں سے آزاد ہو گیا۔“

قید سے رہائی کے بعد، بیورغ اپنے ارادے سے باز نہیں آیا۔ اور ایک

رات محل کی دیوار پر کیلیں بھٹکتا ہوا چڑھ گیا۔ اور گراناز کے پاس جا کر

اسے یلند سے جگایا۔ اس واقعہ کو بیورغ اپنے کلام میں یوں بیان کرتا ہے۔

”میرے شیروں جیسے قدموں کی آہٹ سے کالی گھٹاؤں
 جیسی پیچ درپیچ زلفوں والی محبوبہ ہرنی کی طرح بدک کر
 یمنہ سے اٹھ گئی۔ وہ چارپائی اور بستر سے کود پڑی اور خوف
 سے دُور کسی کونے میں جا کر لرزنے لگی۔“

آخر بیورخ نے اسے دم دلاسا دیا اور کہا کہ بے خطر بیٹھ جاؤ میں کسی
 نیت سے نہیں آیا ہوں۔ اس سے یوں مخاطب ہوتا ہے کہ
 ”میں وہی شخص ہوں جس نے تمہیں محل کے نیچے سے قول دیا تھا
 اب میں اسی قول کو نبھانے آیا ہوں۔“

گراناں اس سے پرچھا کہ یہاں تک تم کیسے آکے۔ ترک تمہیں اور
 مجھے قتل کر دیں گے۔ اس نے اپنے آنے کا طریقہ بتایا۔ اور ترکوں کے خوف
 دُور سے بیباکی کا اظہار کیا کہ

”میں بہادر اور جیالے رند، سردار چاکر اور اس کے ایرانی
 گھوڑوں کے علاوہ کسی اور کو خاطر ہی میں نہیں لاتا۔ نہ
 ہی ان کی موجودگی میں مجھے کسی اور کی پرواہ ہے۔“

قذہار میں اس نے کچھ عرصہ اور گزارا۔ اور اپنے قیام کے دوران گراناں

کے پاس آنے جانے کا سلسلہ برقرار رکھا۔ آخر جب وہ وہاں سے تنگ آگیا تو دونوں نے آپس میں صلح کی۔ اور یہ فیصلہ کر لیا۔ بقول بیورغ۔

” آؤ وہاں چلے جائیں جو بلوچوں کا دلیس ہے۔ وہ سیوی

کا دلیس جو مجھے جان و دل سے پیارا ہے۔“

بیورغ گراناز کو محل سے اتار کر قنڈھار سے نکال لانے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ بولان میں جب پہنچے تو گراناز نے پوچھا کہ اب کسی کے پاس جانے کا ارادہ ہے۔ تو بیورغ نے بتایا کہ چاکر رند کے پاس۔ تو گراناز نے مشورہ دیا کہ وہ تو ویسے بھی تمہارا اپنا ہے۔ اگر ترکوں نے حملہ کیا تو وہ مجبوراً تمہاری مدد کے لئے نکلے گا۔ البتہ ہمیں گواہرام لاشاری کے پاس جانا چاہیئے۔ تاکہ وہ ہمیں پناہ دے اور اس طرح میر گواہرام کے پاس آئے۔ میر گواہرام نے جب بیورغ کو اپنے پاس آتے دیکھا تو وہ رندوں کے ساتھ اپنی دشمنیاں بھول گیا۔ اور اس نے ان کو خوش آمدید کہا۔ اور وہاں رکھا۔ ترکوں نے دوسری جانب لشکر کشی کی اور میر گواہرام کو پیغام بھیجا کہ یا تو گراناز کو واپس کیا جائے ورنہ جنگ کے لئے تیار ہو جائے۔ میر گواہرام نے رندوں کے ساتھ دشمنی اور کشت و خون کے

باوجود کہا کہ میں اپنی پناہ میں آئے ہوئے شخص کو ہرگز تمہارے حوالے نہیں کر سکتا۔ جو بلوچی ضابطہ اخلاق کے خلاف ہے۔ چنانچہ وہ جنگ کے لئے تیار ہو گیا۔ اور میر چاکر کو بھی پیغام بھیج کر صورتحال سے آگاہ کر دیا۔ رند اور لاشاری قبائل اکیار پھر متحد ہو گئے اور ترکوں کے خلاف جنگ کے لئے تیار ہو گئے۔ مگر بیورغ کو یہ بات پسند نہیں تھی۔ کہ اس کی خاطر لوگوں کا خون بہایا جائے۔ دونوں فوجیں آمنے سامنے تھیں۔ دوسری صبح سورج نکلنے ہی تلواریں چلنے والی تھیں۔ اور بیورغ اس صورتحال سے بچنے کی ترکیب سوچ رہا تھا۔

بیورغ رات گئے گراناز کو اکیلا چھوڑ کر ہتھیار سجائے ترک بادشاہ کے لشکر کی جانب روانہ ہو گیا۔ وہ چوری چھپے لشکر میں داخل ہوا اور سردھا بادشاہ کے خیمہ کے اندر داخل ہو گیا۔ بادشاہ سویا ہوا تھا۔ وہ بادشاہ کے ہاتھ دابنے لگا۔ حتیٰ کہ بادشاہ کی آنکھ کھلی۔ اس نے اجنبی شخص کو دیکھ کر حیران ہو گیا۔ اتنے میں بیورغ بولا۔ بادشاہ سلامت بیورغ آپ کے سامنے موجود ہے۔ بادشاہ اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ بیورغ بولا۔ بادشاہ سلامت آپ ڈریں نہیں۔ اگر میں چاہتا تو آپ کا کام سوتے میں تمام کر سکتا تھا۔

لیکن کسی بلوچ کے لئے کسی کو للکارے بغیر قتل کرنا معیوب ہے ۔ اور آپ سورہے تھے ۔ اور پھر آپ گراناز کے باپ ہیں ۔ میں اپنا سر آپ کی خدمت میں لے آیا ہوں ۔ آپ کو اختیار ہے ۔ بیشک میری ہی تلوار سے میرا سر قلم کریں ۔ لیکن لڑائی کا کوئی فائدہ نہیں ۔ بادشاہ نے اس کے یہ کلمات سنے تو اسے گلے لگایا اور کہا ۔ تم نے اپنی جان کی پرداہ نہیں کی اور لشکر میں گھس کر مجھ تک پہنچے ۔ اور میرا اتنا خیال رکھا ۔ میں گراناز کو تم جیسے غیرت مند اور بہادر شخص کو بخش دیتا ہوں ۔ اس طرح بیورغ کی عقلمندی سے جنگ و جدل ہوتے ہوتے رہ گئی ۔ اور اسے گراناز بھی مل گئی ۔ ترک واپس قندھار چلے گئے ۔